''خوشبو'' کی نوخیز کا سفر

ڈاکٹر گلشن طارق

Dr. Gulshan Tariq

Dean of Languages, Lahore Garrison University, Lahore.

Abstract:

'Khushbu' ki Naukhaiz ka Safar'

Parveen Shakir stands supreme among the celebrated female Urdu poets. She not only promoted the artistic traditions of Urdu poetry but also made valuable addition to it. She met a sad demise in a roadside accident. Her four books of poetry entitled Khushbu, Sadd-berg, Khud Kalami and Inkar were published and later compiled into one volume named Maah-e-Tamaam. Khushbu is her first collection of poetry. This publication earned her great acclaim. The theme of Khushbu revolves around the feelings and sentiments of a young girl. The initial poems express the pain of inaccessibility experienced by the girl. Later in the book she is found cherishing the yearned union. Eventually she is doomed to get separated from the beloved. So, the motifs of union and separation recur in the book. And this is considered to be the essence of Khushbu.

بیسویں صدی کے اردو ادب میں پروین شاکر اس لحاظ سے منفرد و ممتاز ہیں کہ وہ بیک وقت بلند پایہ شاعرہ اور صاحبِ طرز نثر نگار ہیں۔ انھوں نے بتیس برس تک شعروادب کی اپنے خونِ جگر سے آبیاری کی۔ انھوں نے اردو شاعری کی فنی روایات کو نا صرف آگے بڑھایا بلکہ ان روایات میں قابلِ قدر اضافہ بھی کیا۔ پروین شاکر کا اپنی ذات اور فن کو منوانا اور بحیثیت شاعرہ ادبی افق پر چھا جانا ایک کارنامہ ہے۔

پروین شاکر کا تعلق ایک مہذب، معزز سادات گھرانے سے تھا۔ وہ ۲۴ نومبر ۱۹۵۲ء کو کراچی میں پیدا ہوئیں۔ وہ شاکر حسین زیدی کی دوسری اولاد تھیں۔ ان کے والدین پیار سے انہیں ''پارو'' کے

نام سے پکارتے تھے۔ بچپن میں انھیں گڑیا کھیلنے سے رغبت نہ تھی۔ ان کو کھیلوں میں بہت دلچسپی تھی ان کو جھولا جھولنا بہت پسند تھا۔ وہ بچوں کے رسالے شوق سے پڑھتی تھیں۔ میٹھی چیزیں پروین شاکر کو بہت مرغوب تھیں۔ انھیں پالتو جانوروں سے بہت دلچسپی تھی۔ جب ان کا کوئی پالتو جانور مر جاتا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر روتیں۔ وہ سکول میں منعقد ہونے والے مقابلہ نعت، مضمون نویسی اور تقریری مقابلوں میں حصہ لیتیں اور انعام حاصل کرتیں۔ ۱۹۶۶ء میں انھوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۷۲ء میں انھوں نے کراچی یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا۔ سرسید کالج کراچی میں تعلیم کے دوران کالج میگزین میں ان کی پہلی نظم شائع ہوئی۔ وہ دوران تعلیم ریڈیو پر ہونے والے مشاعروں میں شرکت کرتی رہیں اور معروف ادبی شخصیات سے ان کا تعارف ہوتا رہا۔ رضیہ فصیح احمد ''گل دستے اور گل دائرے'' میں پروین شاکر کے متعلق لکھتی ہیں:

> ''اس پُر اعتماد لڑکی کو دیکھ کر رشک آتا تھا۔ وہ پر اعتماد کیوں نہ ہوتی کہ بہت کم عمری میں انگریزی ادب اور لسانیات میں ایم اے کر چکی تھی اور کالج میں پڑھانے لگی تھی۔ خوش شکل تھی، خوش مزاج تھی، خوش آواز تھی۔ کچھ لوگوں کے نزدیک وہ خوش مزاج نہیں بھی تھی، لیکن اس کی کچھ وجہ بھی تھی۔۔۔ بغیر کانٹیکٹ لینز کے سادہ سے بالوں میں وہ تھوڑی سی مختلف نظر آتی تھی۔ مگر جب وہ تیار ہو کر نکلتی تھی تو وہ پروین شاکر ہوتی تھی کہ جس دم اسٹیج سے اتر کر جاتی تھی تو کتنے ہی لوگ جلو میں، بات کرنے کے مشتاق ساتھ ساتھ چلتے تھے۔''(۱)

بیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ ایک جانی پہچانی اور مقبول شاعرہ تھیں۔ اور ان کی ادبی کاوشوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ نوجوانی میں عشق کے تجربے سے دوچار ہوئیں۔ جہاں وہ چاہتی تھیں وہاں ان کی شادی نہ ہو سکی۔ نارسائی کی یہ کسک ہمیں ان کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو پروین کی شادی ڈاکٹر نصیر علی کے ساتھ انجام پائی۔ ان دنوں وہ عبداللہ کالج میں انگریزی پڑھانے پر مامور تھیں۔ اور مشاعروں میں بھی شرکت کرتی تھیں۔ سسرالیوں کا رویہ ان کے ساتھ اچھا نہ تھا۔ اس لئے وہ ذہنی دباؤ کا شکار ہو گئیں۔ میاں بیوی میں ذہنی ہم آہنگی نہ تھی۔ تاہم وہ دونوں اس شادی کو کامیاب بنانے کی کوشش کرتے رہے لیکن ان کی کوششیں بارآور ثابت نہ ہوئیں۔ اور یہ شادی بالآخر ختم ہو گئی۔

۱۹۷۷ء میں پروین شاکر کا پہلا مجموعہ کلام ''خوشبو'' کے نام سے شائع ہوا اور پروین شاکر کی شاعری کی خوشبو ہر طرف پھیل گئی۔ بعد میں اس مجموعہ کلام کو آدم جی ادبی ایوارڈ بھی ملا۔ عورت پروین شاکر کی شاعری کا خاص موضوع ہے۔ عورت جو کہیں عاشق ہے اور کہیں معشوق۔ اس دنیا کی تمام رنگا رنگی عورت سے ہے۔ علامہ اقبال ''ضرب کلیم'' میں عورت کے بارے کہتے ہیں:

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں(۲)

اس بات کا تصور کیا جائے کہ اگر عورت نہ ہوتی تو کیا ہوتا؟ تو جو بات ذہن میں آتی ہے وہ یہ کہ نہ کہیں رنگ ہوتا، نہ کہیں خوشبو، نہ کہیں چہچہے نہ کہیں قہقہے۔ نہ کہیں خوشی ہوتی نہ کہیں غم۔ بس ایک سناٹا ہوتا۔ معلوم یہ ہوا کہ اس دنیا کی تمام رونق، ہلچل، اور چہل پہل عورت سے ہے۔ پروین بھی ایک عورت ہے جو عورت کے جذبات و احساسات کو خوب سمجھتی ہے۔ ''خوشبو'' کے بارے میں مسرت حفیظ اپنے ایک مضمون ''عکس خوشبو'' میں رقم طراز ہیں:

> ''خوشبو'' ایک معصوم لڑکی کے جذباتی سفر کی کہانی ہے۔ یہ ایک ایسے تخیل سفر کی داستان ہے جو کمسنی کے جذبات پر منتج ہوتی ہے۔ خوشبو میں جو لڑکی جذبوں کی صداقتیں تلاش کرنے کے سفر پر نکلتی ہے وہ اپنا بیشتر سفر خوابوں کی حسین اور خوبصورت وادیوں میں اکیلے طے کرتی ہے، لیکن کسی کے پیار کا مضبوط بندھن ہر قدم پر سہارا دیتا ہوا اور کسی کا چاند چہرہ تیرہ شبوں میں روشنیاں بکھرتا رہے تو تنہائی کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔''(۳)

پروین شاکر کی ''خوشبو'' کا سفر کچی عمر کی لڑکی سے شروع ہوتا ہے۔ نو عمری (ٹین ایج) عمر کا وہ حصہ ہوتا ہے جس میں سے گزرنے والے کو سب ہرا ہرا نظر آتا ہے۔ بلا وجہ ہنسی آتی ہے بلا وجہ رونا آتا ہے۔ کبھی ان دیکھی ہستی کا انتظار رہتا ہے۔ اس عمر میں وہ اپنے اندر پیدا ہونے والے جذبوں کو سمجھ نہیں پاتی:

ہتھیلیوں کی دعا پھول لے کے آئی ہو
کبھی تو رنگ مرے ہاتھ کا حنائی ہو!
کوئی تو ہو جو میرے تن کو روشنی بھیجے
کسی کا پیار ہوا میرے نام لائی ہو!
وہ سوتے جاگتے رہنے کے موسموں کا فسوں
کہ نیند میں ہوں مگر نیند بھی نہ آئی ہو!(۴)

نو عمری میں لڑکی اپنے جذبات کو دوسروں سے چھپانے کی ناکام کوشش کرتی ہے:

کانپ اٹھتی ہوں میں یہ سوچ کے تنہائی میں
میرے چہرے پہ ترا نام نہ پڑھ لے کوئی(۵)

کچی عمر میں وہ خوشبوؤں کو محسوس کرتی ہے۔ تتلیوں کے رنگ اس کو مسحور کر دیتے ہیں۔ پرندوں کی چہچہاہٹ اور جھرنوں کا ترنم اس کی روح کی تاروں کو ہلاتا ہے۔ کچی عمر کے خواب اس کو بہت بے چین رکھتے ہیں اور یہ خواب وہ سوتے جاگتے دیکھتی ہے۔ جب وہ خواب حقیقت میں نہیں

بدلتے تو وہ ٹوٹ جاتی ہے، بکھر جاتی ہے۔ تب وہ دکھ کے لمس سے آشنا ہوتی ہے۔ نارسائی کی کسک اس کو بے چین رکھتی ہے:

کوئی آہٹ کوئی آواز ، کوئی چاپ نہیں
دل کی گلیاں بڑی سنسان ہیں ___ آئے کوئی(۶)

ایسی صورت حال میں جب اس کے اندر کا موسم حبس زدہ ہوتا ہے۔ باہر کا موسم چاہے کتنا ہی خوشگوار کیوں نہ ہو اس پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ سرخ سیال لاوا بن کر نس نس میں دوڑتا ہے۔ جو اس کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ اسے ایسے میں وہ سامنے آنے والی ہر روکاوٹ سے ایک سیلابی ریلے کی طرح گزر جاتی ہے:

ہونٹ بے بات ہنسے
زلف بے وجہ کھلی
خواب دکھلا کے مجھے
نیند کس سمت چلی
خوشبو لہرائی، مرے کان میں سرگوشی کی
اپنی شرمیلی ہنسی میں نے سنی
اور پھر جان گئی
میری آنکھوں میں تیرے نام کا تارہ چمکا!(۷)

اس عمر میں تخیل کی کارفرمائی عروج پر ہوتی ہے۔ تخیل کے ذریعے وہ ان دیکھی دنیا کا سفر کرتی ہے۔ یہ سفر وہ جاگتے ہوئے مگر بند آنکھوں سے کرتی ہے:

میں کچی نیند میں ہوں
اور اپنے نیم خوابیدہ تنفس میں اترتی
چاندنی کی چاپ سنتی ہوں
گماں ہے
آج بھی شاید
مرے ماتھے پہ تیرے لب، ستارے ثبت کرتے ہیں!(۸)

اس کے اندر محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہے اور لہریں اچھل اچھل کر کناروں کی طرف آتی ہیں۔ مگر نارسائی کے سبب واپس پلٹ جاتی ہیں۔ ایک دن تصوراتی شہزادہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ تب اس کے دل کے سمندر میں موجود لاوا پھٹ پڑتا ہے جو اس کے وجود میں بکھر کر محبت کی آگ دہکا دیتا ہے:

سوتے میں بھی

چہرے کو آنچل سے چھپائے رہتی ہوں
ڈر لگتا ہے
پلکوں کی ہلکی سی لرزش
ہونٹوں کی موہوم سی جنبش
گالوں پر رہ رہ کے اترنے والی دھنک
لہو میں چاند رچاتی اس ننھی سی خوشی کا نام نہ لے لے
نیند میں آئی ہوئی مسکان
کسی سے دل کی بات نہ کہہ دے!(۹)

جب محبت کی آگ کی لپٹیں محبوب تک پہنچنے لگتی ہیں۔ تب وہ اپنی ہم جولیوں کے درمیان تتلی کی طرح اڑتی پھرتی ہے:

دور اپنے خیالوں میں گم
شاخ در شاخ
اک تیتری، خوشنما پر سمیٹے ہوئے، اڑ رہی ہے
مجھے ایسا محسوس ہونے لگا ہے
جیسے مجھ کو بھی پر مل گئے ہوں!(۱۰)

اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ چاند ستاروں سے باتیں کرے، محبت کے پروں سے ہواؤں کے سنگ بادلوں کے ساتھ اڑے:

تتلیوں کی بے چینی آبسی ہے پاؤں میں
ایک پل کو چھاؤں میں، اور پھر ہواؤں میں(۱۱)

اس کی زندگی میں آرام، سکون چین اور قرار ختم ہو جاتا ہے۔ ''خوشبو'' ایسی ہی نوخیز کا سفر ہے۔ پروین شاکر نے ''دریچۂ گل سے'' کے عنوان سے ''خوشبو'' کا آغاز کیا ہے۔ اس میں وہ ''خوشبو'' کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''محبت جب تقاضائے جسم و جاں سے ماورا ہو جائے تو الہام بن جاتی ہے ___ حسن جب لطافت کی آخری حدوں کو چھو لے تو خوشبو بن جاتا ہے ___ خوشبو حسن کی تکمیل ہے! اس سے کوئی سخن فہم یہ نہ جانے کہ اس لڑکی کو تکمیل حسن کا دماغ ہے ___ تکمیل حسن کا خیال صرف اسے زیب دیتا ہے جس نے تخلیقِ حسن کی ___ البتہ اتنا ضرور ہے کہ آپ سے بچھڑنے سے پہلے یہ لڑکی ''خوشبو'' کا تعارف پورے اعتماد سے کرا رہی ہے۔''(۱۲)

پروین شاکر کی شاعری میں کچی کلیوں کی مہکار، چوڑیوں کی کھنکار اور پائل کی چھنکار ہے جو اٹھتی جوانی کا لازمہ ہے:

ہاتھوں کی اک اک چوڑی میں
موہن کی جھنکار
سہج چلے، پھر بھی پائل میں
بولے پی کا پیار (۱۳)

نوخیز کی یہی ادائیں عاشقوں کو دیوانہ بنا دیتی ہیں اور نوخیز کی خوشبو کے ساتھ سفر کرتے کرتے وہ محبوب تک پہنچ جاتے ہیں اور اپنی منزل تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کے دل کا شگوفہ کھل اٹھتا ہے۔ خوشبو کے بارے میں پروین شاکر کہتی ہیں:

تری وفا کی مہک ، تیرے پیار کی خوشبو
زبان کوئی بھی ہو خوشبو کی ___ وہ بھلی ہوگی! (۱۴)

''صرف ایک لڑکی'' میں پروین شاکر کہتی ہیں:

کاش مرے پَر ہوتے
ترے پاس اڑ آتی
کاش میں ہوا ہوتی
تجھ کو چھو کے لوٹ آتی
میں نہیں مگر کچھ بھی
سنگ دل رواجوں کے
آہنی حصاروں میں
عمر قید کی ملزم
صرف ایک لڑکی ہوں! (۱۵)

بہار کا موسم تو ہر ایک کو اچھا لگتا ہے تو پھر نوخیز کے لئے تو یہ موسم بہت خاص ہوتا ہے۔ نظم ''بسنت بہار کی نرم ہنسی'' میں پروین شاکر کہتی ہیں:

بسنت بہار کی نرم ہنسی
آنگن میں چھلکی
بھیگ گئی مری ساری
پھر ___ پروا کی شوخی!
کیسے اپنا آپ سنبھالوں

آنچل سے تن ڈھانپوں ___ تو
زلفیں کھل جائیں
زلف سمیٹوں
چھلکے گا!(۱۶)

''وہی نرم لہجہ'' میں پروین شاکر کہتی ہیں:

وہی نرم لہجہ!
مجھے چھیڑنے پر جب آئے تو ایسا لگے
جسے ساون کی چنچل ہوا
سبز پتوں کے جھانجھن پہن
سرخ پھولوں کی پائل بجاتی ہوئی
میرے رخسار کو
گاہے گاہے شرارت سے چھونے لگے
میں جو دیکھوں پلٹ کے، تو وہ
بھاگ جائے ___ مگر
دور پیڑوں میں چھپ کر ہنسے
اور پھر ___ ننھے بچوں کی مانند خوش ہو کے تالی بجانے لگے!(۱۷)

ایک اور جگہ پروین شاکر نوخیز کی زبانی کہتی ہیں:

کُو بہ کُو پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی(۱۸)

کون چاہے گا تمھیں میری طرح
اب کسی سے نہ محبت کرنا(۱۹)

نارسائی جب رسائی میں بدل جاتی ہے تو جذبات کی نوعیت بھی مختلف ہو جاتی ہے۔ رسائی کے بعد فریقین کے رویوں میں تبدیلی آجاتی ہے۔ رویوں میں تبدیلی سے نوخیز زیادہ متاثر ہوتی ہے کیوں کہ اس سماج میں لڑکی اور لڑکے کے لیے مختلف اخلاقی اقدار ہیں۔ لڑکی کے لئے کئی ایک پابندیاں ہیں جبکہ لڑکا ان سے کافی حد تک آزاد ہوتا ہے۔ رسائی جب نارسائی میں بدلنے لگتی ہے تو نوخیز دکھی ہو جاتی ہے۔ پروین اسے مشورہ دیتی ہیں:

ننھی لڑکی

ساحل کے اتنے نزدیک
ریت سے اپنے گھر نہ بنا
کوئی سرکش موج ادھر آئی، تو
تیرے گھر کی بنیادیں تک بہہ جائیں گی
اور پھر ان کی یاد میں تُو
ساری عمر اداس رہے گی! (۲۰)

کچی عمر میں نارسائی کا دکھ سہا نہیں جاتا۔ ان حالات میں وہ کسی کو اپنا دکھ بھی نہیں بتا سکتی:

لڑکیوں کے دکھ عجب ہوتے ہیں، سکھ اس سے عجیب
ہنس رہی ہیں اور کاجل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ (۲۱)

محبوب کے انتظار میں اس کا وقت کاٹے نہیں کٹتا۔ وہ سراپا انتظار، اداس اداس پھرتی ہیں۔ پروین شاکر اپنی نظم ''لڑکیاں اداس ہیں'' میں کہتی ہیں:

پھر وہی نرم ہوا
وہی آہستہ سفر موجِ صبا
گھر کے دروازے پر ننھی سی ہتھیلی رکھے
منتظر ہے
کہ کسی سمت سے آواز کی خوشبو آئے
سبز بیلوں کے خنک سائے سے کنگن کی کھنک
سرخ پھولوں کی سجل چھاؤں سے پائل کی چھنک
کوئی آواز ____ بنام موسم (۲۲)

نوخیز کو انتظار کے کرب آمیز لمحوں کا سامنا ہے۔ پہلے نارسائی تھی پھر رسائی اور اب پھر نارسائی:

دل و نگاہ پہ کس طور کے عذاب اترے
وہ ماہتاب ہی اترا، نہ اس کے خواب اترے
کہاں وہ رت کہ جبینوں پہ آفتاب اترے
زمانہ بیت گیا ان کی آب و تاب اترے (۲۳)

مگر ملن کی رتوں کا زمانہ بیت گیا، اب تنہائی ہے اور یادیں ہیں:

نہیں نہیں! یہ خبر دشمنوں نے دی ہوگی
وہ آئے! آ کے چلے بھی گئے! ملے بھی نہیں! (۲۴)

مگر اب اس پہ کھلتا ہے کہ ملاپ اب ممکن نہیں۔ ایسے عالم میں وہ مایوسیوں کی اتھاہ گہرایوں

میں اتر جاتی ہیں۔اس کا نازک دل زخموں سے چور ہو جاتا ہے۔وقت کا مرہم دھیرے دھیرے زخموں کو مندمل کر دیتا ہے۔مگر نوخیز کا زخم بہت گہرا ہے۔یہ زخم اب دل سے روح میں اتر گیا ہے اور اس کو بھی زخمی کر دیا ہے:

ہم تو سمجھے تھے کہ اک زخم ہے، بھر جائے گا
کیا خبر تھی کہ رگِ جاں میں اتر جائے گا(۲۵)

حوالہ جات

۱۔ رضیہ فصیح احمد گل دستے اور گل دائرے لاہور: رنگ ادب، مارچ ۲۰۱۳ء،ص:۱۷۱
۲۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (اردو)، لاہور: غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۲ء،ص:۵۵۶
۳۔ مسرت حفیظ،عکسِ خوشبو، مشولہ: پروین شاکر احوال و آثار، مرتبہ: احمد پراچہ، اسلام آباد، پذیرائی، ۲۰۰۰ء ص:۱۱۹
۴۔ پروین شاکر، ماہ تمام، اسلام آباد: مراد پبلی کیشنز جہانگیر بکس، س ن، ص:۵۱
۵۔ ایضاً،ص:۴۹
۶۔ ایضاً
۷۔ ایضاً،ص:۳۲
۸۔ ایضاً،ص:۳۴
۹۔ ایضاً،ص:۳۰
۱۰۔ ایضاً،ص:۴۸
۱۱۔ ایضاً،ص:۳۴۰
۱۲۔ ایضاً،ص:۲۲
۱۳۔ ایضاً،ص:۳۳۹
۱۴۔ ایضاً،ص:۸۲
۱۵۔ ایضاً،ص:۹۴
۱۶۔ ایضاً،ص:۲۹۶
۱۷۔ ایضاً،ص:۱۰۳
۱۸۔ ایضاً،ص:۱۱۹
۱۹۔ ایضاً،ص:۱۲۰
۲۰۔ ایضاً،ص:۱۴۳
۲۱۔ ایضاً،ص:۱۶۶
۲۲۔ ایضاً،ص:۱۷۲
۲۳۔ ایضاً،ص:۲۰۳
۲۴۔ ایضاً،ص:۱۶۷
۲۵۔ ایضاً،ص:۱۹۰